ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY



AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1960

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :علوم القرآن • (1960) (2) سطح :بی ایس علوم اسلامیہ) تخصص قرآن و تفسیر(

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ نمبر 1 :تا(5

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس پڑھ کر جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں، کیونکہ بعینہٖ نقل کی گئی مشقیں یونیورسٹی کی پالیسی کے مطابق مسترد کی جا سکتی ہیں۔

سوال نمبر :1 امثال القرآن سے مراد اور امثال القرآن پر علمی مضمون 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ امثال القرآن سے کیا مراد ہے؟ امثال القرآن پر علمی مضمون تحریر کیجئے۔

تعارف

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری اور کامل کتابِ ہدایت ہے جو انسان کی دنیوی و اخروی فلاح کے لیے نازل ہوئی۔ اس کتاب نے اپنے پیغام کو انسانی ذہن و قلب تک پہنچانے کے لیے جہاں دلائل و براہین کا اسلوب اختیار کیا، وہاں مثالوں کا اسلوب بھی بڑی کثرت اور خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا۔ مثال ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے مجرد اور مشکل مفاہیم کو محسوس اور سادہ صورتوں میں پیش کر کے سمجھا دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں درجنوں مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی بات کو مثال کے ذریعے واضح فرمایا اور خود ارشاد فرمایا کہ ہم لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ

وہ غور و فکر کریں۔ علوم القرآن کی اصطلاح میں ان مثالوں کے مطالعے کو" امثال القرآن "کہا جاتا ہے اور یہ اس علم کی اہم شاخوں میں سے ایک ہے، جس پر ائمہ و محققین نے مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

مثل کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

"مثل "عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مماثلت، مشابہت، نظیر اور نمونہ کے ہیں۔ جب کسی چیز کو دوسری چیز کے مشابہ قرار دیا جائے تو اسے مثل کہتے ہیں۔ اصطلاح میں مثل سے مراد وہ تمثیلی بیان ہے جس میں کسی معنوی، عقلی یا غیبی حقیقت کو کسی محسوس اور معروف چیز سے تشبیہ دے کر اس طرح واضح کیا جائے کہ سننے والے کے ذہن میں اس کی تصویر بن جائے اور بات اس کے دل میں اتر جائے۔ امام راغب اصفہانی نے" المفردات "میں مثل کی بحث کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مثل کا استعمال قرآن میں کئی معانی میں ہوا ہے، جن میں صف و بیان، تشبیہ و تمثیل اور عبرت و نصیحت سب شامل ہیں۔ اہلِ بلاغت کے نزدیک قرآنی مثالوں میں تشبیہ کی وہ اعلیٰ صورت پائی جاتی ہے جس میں مشبہ بہ ہمیشہ مشبہ سے زیادہ واضح، زیادہ معروف اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں لفظِ مثل کے مختلف استعمالات

قرآن کریم میں" مثل "اور اس کے مشتقات متعدد معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں یہ لفظ صفت و کیفیت کے معنی میں آیا ہے، جیسے بعض مقامات پر کسی قوم کی حالت اور انجام کا بیان لفظ مثل سے کیا گیا ہے۔ کہیں اس سے مراد عبرت و نصیحت ہے، چنانچہ گزشتہ امتوں کے واقعات کو" مثل "قرار دے کر بعد والوں کے لیے سبق بنایا گیا ہے۔ کہیں مثل سے مراد تمثیلی تشبیہ ہے، مثلاً ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت اور حق و باطل کی حقیقت سمجھانے کے لیے دی گئی تمثیلات۔ کہیں یہ لفظ نمونہ و نظیر کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثل کو حضرت آدم علیہ السلام کی مثل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تنوع سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے لفظ مثل کو ایک وسیع معنوی پس منظر کے ساتھ استعمال کیا ہے اور امثال القرآن کا مطالعہ کرتے وقت ان تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

امثال القرآن کی اقسام

علما نے قرآنی مثالوں کی مختلف اعتبار سے تقسیم کی ہے۔ بیان کے انداز کے اعتبار سے مثالیں تین بڑی اقسام میں منقسم ہیں۔ پہلی قسم" امثالِ ظاہرہ یا صریحہ "ہے، جن میں لفظ مثل یا تشبیہ کا کوئی ادات صراحتاً موجود ہو، مثلاً اللہ تعالیٰ کے نور کی مثال مشکاۃ میں رکھے چراغ سے دی گئی ہے، یا اچھے کلمے کی مثال پاکیزہ درخت سے اور برے کلمے کی مثال خبیث درخت سے دی گئی ہے۔ دوسری قسم" امثالِ کامنہ "ہے، جن میں لفظ مثل موجود نہیں ہوتا مگر معنی و مفہوم کے اعتبار سے وہ تمثیل ہی ہوتی ہے، جیسے بعض آیات میں کسی حالت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ پوری ایک تصویر پیش کرتی ہیں۔ تیسری قسم" امثالِ مرسلہ "ہے، جو کہ اسلوب ضرب المثل کا سا ہوتا ہے، یعنی وہ جملے اپنے جامع اور مختصر انداز کی وجہ سے زندگی کے اصول بن جاتے ہیں، جیسے یہ ارشاد کہ ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، یا یہ کہ انسان خسارے میں ہے۔ اسی طرح موضوع کے اعتبار سے مثالیں توحید، رسالت، ایمان و عمل، دنیا کی بے ثباتی، آخرت اور اخلاقی اقدار سے متعلق ہوتی ہیں۔

چند مشہور قرآنی مثالوں کی تشریح

سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال یوں بیان فرمائی کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایک طاق کی سی ہے جس میں چراغ ہو، چراغ شیشے میں ہو اور وہ شیشہ گویا چمکدار ستارہ ہو۔ مفسرین نے اس مثال کی تشریح میں لکھا ہے کہ مومن کا دل وہ طاق ہے، ایمان اس میں روشن چراغ ہے اور وحی کی روشنی اس چراغ کو مزید جگمگاتی ہے، یہاں تک کہ مومن کا قلب ہدایت کے نور سے بھر جاتا ہے۔ سورۃ العنکبوت میں ان لوگوں کی مثال دی گئی جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنا لیے کہ ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے گھر بنایا اور بےشک گھروں میں سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ اس مثال میں باطل سہاروں کی کمزوری اور بے مائیگی کو نہایت محسوس انداز میں واضح کیا گیا ہے کہ جس طرح مکڑی کا جالا نہ دھوپ سے بچا سکتا ہے نہ بارش سے، اسی طرح غیر اللہ کا سہارا بھی انسان کو کسی مشکل سے نہیں بچا سکتا۔

سورۃ الاعراف میں اس شخص کی مثال دی گئی جسے اللہ نے اپنی آیات عطا کیں مگر وہ ان سے نکل بھاگا اور شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، تو اس کی مثال کتے کی سی بیان کی گئی کہ اگر تم اس پر حملہ کرو تب بھی وہ ہانپتا ہے اور چھوڑ دو

تب بھی ہانپتا ہے۔ یہ مثال اس بدبخت عالم یا طالبِ دنیا کی ہے جس کا علم اسے ہدایت کے بجائے ذلت میں مبتلا کر دے۔ سورۃ ابراہیم میں پاکیزہ کلمے یعنی کلمۂ توحید کی مثال پاکیزہ درخت سے دی گئی جس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے، جبکہ برے کلمے کی مثال اس خبیث درخت کی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو اور اسے کوئی قرار نہ ہو۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی ہر مثال ایک مکمل علمی و اخلاقی درس اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس کی تہیں کھولنے سے حکمت کے خزانے ظاہر ہوتے ہیں۔

امثال القرآن کے مقاصد و فوائد

قرآن کریم میں مثالوں کے بیان کے کئی مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد پیچیدہ اور مجرد حقائق کی توضیح ہے، کیونکہ انسانی ذہن محسوس چیزوں کو جلد سمجھتا ہے اور مثال غیب کی حقیقتوں کو شہود کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔ دوسرا مقصد ترغیب و ترہیب ہے، یعنی نیکی کے نتائج کو دلکش مثالوں میں اور بدی کے انجام کو عبرتناک صورتوں میں پیش کر کے انسان کو عمل پر آمادہ کیا جائے۔ تیسرا مقصد حجت و استدلال ہے، کیونکہ بعض مثالیں خود ایک دلیل ہوتی ہیں جن سے مخالف کا ابطال ہوتا ہے، جیسے شرک کی بے بنیادی مثالوں سے ظاہر کی گئی ہے۔ چوتھا مقصد تثبیتِ قلب ہے کہ مومن مثالوں کے ذریعے اپنے ایمان پر مضبوطی حاصل کرتا ہے۔ پانچواں مقصد یہ ہے کہ مثالیں یاد داشت میں محفوظ ہو جاتی ہیں اور موقع محل پر ذہن میں خود بخود تازہ ہو کر رہنمائی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے علماء نے امثال کو قرآن کے فہم کی کنجیوں میں شمار کیا ہے۔

امثال القرآن پر تصنیفات

امثال القرآن کی اہمیت کے پیشِ نظر مختلف ادوار میں اس موضوع پر قیمتی کتابیں لکھی گئیں۔ امام ابن قیم جوزیہ کی کتاب" الأمثال في القرآن الكريم "اس موضوع کی مشہور ترین تصنیف ہے، جس میں انہوں نے قرآنی مثالوں کی تشریح، ان کے اسرار اور عملی فوائد کو بڑی گہرائی سے بیان کیا ہے۔ امام سیوطی نے اپنی کتاب" الإتقان في علوم القرآن "میں امثال القرآن کو علوم القرآن کی ایک مستقل نوع کے طور پر ذکر کیا اور اس پر لکھنے والوں کی فہرست بھی دی ہے۔ اسی طرح محمد بن ساعد اور دیگر کئی مصنفین نے اس فن پر قلم اٹھایا۔ جدید دور میں بھی اردو و عربی میں امثال القرآن پر

تحقیقی مضامین اور کتابیں سامنے آئی ہیں، جن سے اس موضوع کی مسلسل علمی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ طالب علم کے لیے ان کتب کا مطالعہ مثالوں کے مفاہیم کھولنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔

نتیجہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ امثال القرآن سے مراد قرآن کریم کی وہ تمثیلات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے انسانی فہم کے قریب کر دیا ہے۔ یہ مثالیں محض ادبی حسن کے لیے نہیں بلکہ ہدایت، عبرت، استدلال اور تربیت کے عظیم مقاصد کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ ان مثالوں کا گہرا مطالعہ طالب علم کو قرآن کے مزاج، اس کے اسلوبِ دعوت اور انسانی نفسیات سے اس کی پوری واقفیت سے روشناس کراتا ہے۔ جو شخص ان مثالوں پر غور و فکر کرتا ہے وہ نہ صرف آیات کے معانی بہتر طور پر سمجھتا ہے بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی ان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے، اور یہی ان مثالوں کا حقیقی مقصد ہے۔

سوال نمبر :2 نسخ کی اہمیت اور اس کی شرائط 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ نسخ کی اہمیت اور اس کی شرائط تحریر کیجئے۔

تعارف

علوم القرآن کے اہم ترین مباحث میں سے ایک بحث" ناسخ و منسوخ "کی ہے۔ اس بحث کو سمجھے بغیر قرآن کریم کی بہت سی آیات کا صحیح مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ شریعتِ اسلامیہ اپنے نزول کے تقریباً تئیس سالہ عرصے میں بتدریج نازل ہوئی اور اس دوران بعض احکام حالات و مصالح کے تقاضوں کے مطابق تبدیل بھی ہوتے رہے۔ جب ایک شرعی حکم بعد میں آنے والے دوسرے حکم سے ختم کر دیا جائے تو اس عمل کو نسخ کہا جاتا ہے۔ اس بحث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مفسرین و فقہاء نے اسے قرآن فہمی کی بنیادی شرائط میں شمار کیا ہے اور اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک واعظ سے پوچھا کہ کیا تم ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو؟ اس کے انکار پر فرمایا کہ تم خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

نسخ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

نسخ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی زائل کرنا، ختم کرنا اور منتقل کرنا ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ سورج نے سایہ منسوخ کر دیا، یعنی اسے ختم کر دیا، اور کتاب کی نقل کو بھی نسخہ اسی لیے کہتے ہیں کہ اصل کا مضمون نقل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں نسخ کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ کسی شرعی حکم کو بعد میں آنے والی شرعی دلیل کے ذریعے اس طرح اٹھا دیا جائے کہ اگر یہ بعد کی دلیل نہ ہوتی تو وہ حکم باقی رہتا۔ اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ نسخ کا تعلق صرف شرعی عملی احکام سے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کا اختیار ہے، کیونکہ وہی شارع ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ کس وقت انسانوں کے لیے کون سا حکم زیادہ موزوں ہے۔

قرآن و سنت سے نسخ کا ثبوت

نسخ کا ثبوت خود قرآن کریم سے ملتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر رکھتا ہے۔ اس آیت نے نسخ کے وقوع اور اس کی حکمت دونوں کو واضح کر دیا۔ اسی طرح سورۃ النحل میں ارشاد ہے کہ جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لے آتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے۔ سنتِ نبوی سے بھی نسخ کی بے شمار مثالیں ثابت ہیں، مثلاً ابتداءً قبرستان کی زیارت سے منع فرمایا گیا تھا، بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً فرمایا کہ میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب تم زیارت کیا کرو۔ ان دلائل سے جمہور امت کا اتفاق ہے کہ شریعت میں نسخ واقع ہوا ہے۔

نسخ کی اہمیت

نسخ کی اہمیت کئی پہلوؤں سے نمایاں ہے۔ سب سے پہلی اہمیت یہ ہے کہ نسخ شریعت کی تدریجی تربیت کا مظہر ہے۔ عرب معاشرہ جن برائیوں میں گہرا ڈوبا ہوا تھا، اگر تمام احکام یکایک نازل کر دیے جاتے تو ان پر عمل انتہائی مشکل ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و حکمت سے احکام کو آہستہ آہستہ نازل کیا، نماز، روزہ، زکاۃ اور شراب کی حرمت جیسے احکام میں تدریج اسی اصول کی جلی مثالیں ہیں۔ اس تدریج نے امت کی نفسیاتی و عملی تربیت کو آسان بنا دیا۔ دوسری

اہمیت یہ ہے کہ نسخ اللہ تعالیٰ کی رحمت و آسانی کا اظہار ہے، کیونکہ بعض مقامات پر سخت حکم کو ہلکے حکم سے بدل دیا گیا، جیسے رات کے قیام اور عدت کے احکام میں تخفیف ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا مقصد انسان کو مشقت میں ڈالنا نہیں بلکہ اس کی بھلائی ہے۔

تیسری اہمیت یہ ہے کہ نسخ امت کی ابتلا و آزمائش کا ذریعہ بھی ہے، کیونکہ جب حکم تبدیل ہوتا ہے تو مومن کی اطاعت و فرمانبرداری آزمائی جاتی ہے کہ وہ اپنی خواہش کے بجائے حکمِ الٰہی کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ قبلے کی تبدیلی کے موقع پر قرآن نے خود تصریح کی کہ ہم نے یہ تبدیلی اس لیے کی تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے۔ چوتھی اہمیت فقہی و تفسیری ہے، کیونکہ ناسخ و منسوخ کی معرفت کے بغیر مفسر آیات کے درمیان بظاہر محسوس ہونے والے اختلاف کو حل نہیں کر سکتا اور فقیہ صحیح حکم تک نہیں پہنچ سکتا۔ پانچویں اہمیت یہ ہے کہ نسخ اس بات کی دلیل ہے کہ شریعتِ محمدیہ سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر کے آئی ہے اور یہ دین قیامت تک کے لیے مکمل و آخری ہے، کیونکہ نزولِ وحی کے خاتمے کے بعد نسخ کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔

نسخ کی شرائط

علما نے نسخ کے صحیح ہونے کے لیے چند شرائط مقرر کی ہیں جن کے بغیر کسی حکم کو منسوخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ نسخ صرف شرعی عملی حکم میں واقع ہوتا ہے۔ عقائد، اخلاقی اصول، توحید و رسالت کے حقائق اور گزشتہ واقعات کی خبریں منسوخ نہیں ہوتیں، کیونکہ خبر اور عقیدہ اگر منسوخ ہو تو اس کا مطلب گزشتہ بیان کی تکذیب ہوگا جو وحی کے شایانِ شان نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ منسوخ ہونے والا حکم بھی شرعی دلیل سے ثابت ہو اور اسے ختم کرنے والا حکم بھی شرعی دلیل ہی ہو، یعنی ناسخ اور منسوخ دونوں کا ماخذ وحی ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ناسخ کا نزول یا ورود منسوخ کے بعد ہو، یعنی دونوں کے درمیان زمانی ترتیب معلوم ہو۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کون سا حکم پہلے آیا اور کون سا بعد میں، تو نسخ کا دعویٰ درست نہیں ہوگا، اسی لیے نسخ کا علم تاریخِ نزول اور اسبابِ نزول سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ ناسخ و منسوخ کے درمیان حقیقی تعارض موجود ہو اور دونوں کو کسی معقول تاویل سے جمع کرنا ممکن نہ ہو۔ اگر دونوں احکام کو جمع کیا جا سکتا ہو، مثلاً ایک عام ہو اور دوسرا خاص، یا ایک مطلق ہو اور دوسرا مقید، تو نسخ کا دعویٰ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ فقہی اصول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دلیلوں کو قابلِ عمل بنایا جائے نہ کہ ایک کو ساقط کیا جائے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ ناسخ اپنی قوت و دلالت میں منسوخ کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہو، کیونکہ کمزور دلیل مضبوط دلیل کو ختم نہیں کر سکتی۔ چھٹی شرط یہ ہے کہ منسوخ حکم کسی ایسی مدت کے ساتھ مقید نہ ہو جو پوری ہو چکی ہو، کیونکہ مدت پوری ہونے پر حکم کا ختم ہونا نسخ نہیں کہلاتا۔ ان شرائط کی سختی ہی کا نتیجہ ہے کہ محققین نے منسوخ آیات کی تعداد بہت کم بیان کی ہے، چنانچہ جہاں بعض نے سیکڑوں آیات کو منسوخ کہا، وہاں امام سیوطی نے تقریباً اکیس آیات اور شاہ ولی اللہ نے صرف پانچ آیات میں نسخ تسلیم کیا ہے۔

نتیجہ

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ نسخ علوم القرآن کی ایک ناگزیر اور نہایت اہم بحث ہے جو شریعت کی حکمت، تدریج اور رحمت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کی معرفت مفسر و فقیہ کے لیے لازم ہے تاکہ احکام کا صحیح تعین ہو سکے۔ تاہم نسخ کا دعویٰ کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے مقررہ شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے، اور جہاں جمع و تطبیق ممکن ہو وہاں نسخ کی طرف جانا درست نہیں۔ یہی متوازن رویہ محققینِ امت کا طریقہ رہا ہے، جس سے قرآن فہمی میں صحت بھی آتی ہے اور افراط و تفریط سے بچاؤ بھی رہتا ہے۔

سوال نمبر :3 مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مابین مناسبت 20) نمبر(

سوال نمبر3 ۔ مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مابین مناسبت واضح کریں۔

تعارف

قرآن کریم کے اسالیبِ بیان میں سے ایک نمایاں اسلوب قسم کا ہے۔ بہت سی سورتوں کا آغاز قسموں سے ہوتا ہے اور بہت سی آیات کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کسی عظیم حقیقت کی تاکید کے لیے اپنی مخلوقات کی قسمیں کھائی ہیں۔ علوم

القرآن میں اس بحث کو" اقسام القرآن "کہا جاتا ہے۔ اس بحث کا ایک نہایت لطیف اور اہم پہلو یہ ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے، جسے" مقسم بہ "کہتے ہیں، اور جس بات کی تاکید کے لیے قسم کھائی جاتی ہے، جسے" مقسم علیہ " یا" جوابِ قسم "کہتے ہیں، ان دونوں کے درمیان ایک گہری مناسبت اور منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ اس مناسبت کو سمجھنا قرآنی بیان کی حکمت و بلاغت کو سمجھنے کی کنجی ہے، اسی لیے مفسرین، خصوصاً امام ابن قیم نے اپنی کتاب "التبیان فی اقسام القرآن "میں اس مناسبت کی توضیح پر خصوصی توجہ دی ہے۔

قسم، مقسم بہ اور مقسم علیہ کا مفہوم

قسم کے لغوی معنی کسی بات کو مضبوط و مؤکد کرنے کے ہیں۔ عربی اسلوب میں جب کوئی بات غیر معمولی اہمیت کی ہو یا سننے والے کے ذہن میں اس کے بارے میں تردد ہو تو اسے قسم کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ مقسم بہ وہ ذات یا چیز ہے جس کی قسم کھائی جائے۔ قرآن میں مقسم بہ کبھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسے بعض مقامات پر رب العالمین کی قسم آئی ہے، اور زیادہ تر مخلوقات میں سے کوئی عظیم الشان چیز ہوتی ہے، مثلاً سورج، چاند، رات، دن، آسمان، زمین، انجیر، زیتون اور عصر یعنی زمانہ۔ مقسم علیہ وہ دعویٰ یا خبر ہے جس کی تصدیق و تاکید مقصود ہوتی ہے، مثلاً قیامت کا وقوع، قرآن کا وحی ہونا، انسان کے اعمال کا جواب دہ ہونا اور نیکی و بدی کے الگ الگ انجام۔ قسم کا اصل مقصد مقسم علیہ کی عظمت و صداقت کو دل میں بٹھانا ہوتا ہے۔

مناسبت کی بنیادی صورتیں

مقسم بہ اور مقسم علیہ کی مناسبت کی پہلی اور نمایاں ترین صورت یہ ہے کہ مقسم بہ خود مقسم علیہ کے لیے دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا قسم کھا کر ساتھ ہی اس دعوے کا ثبوت بھی پیش کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کے الٰہی کلام ہونے کا دعویٰ کیا تو ستاروں کے مقامات کی قسم کھائی، کیونکہ نظامِ فلک کی حیرت انگیز ترتیب و حکمت خود اس بات کی شاہد ہے کہ اس کائنات کا خالق جو کچھ کہتا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قیامت کے برپا ہونے پر جن مخلوقات کی قسمیں کھائی گئیں، ان کی پیدائش و فنا اور تغیر و تبدل اس بات کی دلیل ہے کہ جو ذات پہلی بار پیدا کر سکتی ہے وہ دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔ اس صورت میں قسم محض تاکید نہیں رہتی بلکہ استدلال بن جاتی ہے۔

مناسبت کی دوسری صورت یہ ہے کہ مقسم بہ مقسم علیہ کے موضوع سے براہِ راست متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ العصر میں زمانے کی قسم کھا کر انسان کے خسارے اور نجات کی شرائط بیان کی گئیں، اور یہ مناسبت بالکل واضح ہے، کیونکہ انسان کی پوری زندگی اور اس کے اعمال اسی زمانے کے اندر واقع ہوتے ہیں، گویا زمانہ خود انسان کے نفع و نقصان کا گواہ ہے۔ سورۃ اللیل میں رات و دن اور نر و مادہ کی پیدائش کی قسم کھا کر انسانوں کی کوششوں کے اختلاف کو بیان کیا گیا، اور مناسبت یہ ہے کہ جس طرح رات و دن اور نر و مادہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح انسانوں کی کوششیں اور ان کے انجام بھی مختلف ہیں۔ سورۃ التین میں انجیر و زیتون، طورِ سینا اور شہرِ مکہ کی قسم کھا کر انسان کی بہترین ساخت اور پھر اس کی پستی کا ذکر کیا گیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ مقامات ان انبیاء کی سرزمینوں سے متعلق ہیں جن کے ذریعے انسانیت کو ہدایت ملی، اور انسان کی تخلیق و انجام کا ذکر اسی لیے ان مقدس مقامات کی قسم کے ساتھ کیا گیا۔

چند نمایاں مثالوں کی مزید توضیح

سورۃ الشمس اس مناسبت کی بہترین مثال ہے۔ اس سورت میں سورج اور اس کی روشنی، چاند، دن، رات، آسمان، زمین اور انسانی نفس کی مسلسل قسمیں کھانے کے بعد فرمایا گیا کہ جس نے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے آلودہ کیا وہ ناکام ہوا۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ قسموں میں بیان کی گئی تمام اشیاء اپنی اپنی جگہ ایک متوازن نظام رکھتی ہیں اور ہر چیز اپنے مقام پر رہ کر کمال کو پہنچتی ہے، اسی طرح انسانی نفس کی فلاح بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنے مقام یعنی تقویٰ و طہارت پر قائم رہے۔ یہ مناسبت سورت کے پورے مرکزی خیال کو کھول دیتی ہے۔ اسی طرح سورۃ الفجر میں فجر، دس راتوں، جفت و طاق اور چلتی ہوئی رات کی قسم کے بعد گزشتہ مغرور قوموں عاد، ثمود اور فرعون کے انجام کا ذکر ہے اور پھر انسان کی آزمائش کا بیان ہے، گویا زمانے کے اتار چڑھاؤ کی قسمیں اس حقیقت کی تمہید ہیں کہ دنیا کی طاقت و دولت عارضی ہے اور اصل فیصلہ اعمال پر ہوگا۔

سورۃ الضحیٰ میں دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قسم کھا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے۔ یہاں مناسبت لطیف معنوی ہے :جیسے رات کے بعد دن کی روشنی ضرور آتی ہے اور رات کا اندھیرا ہمیشہ نہیں رہتا، اسی طرح وحی کے وقتی انقطاع کے بعد نزول کا سلسلہ پھر

جاری ہوگا اور غم کے بعد راحت ضرور آئے گی۔ سورۃ القلم میں قلم اور لکھے ہوئے کی قسم کھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و کردار کی براءت بیان کی گئی، اور مناسبت یہ ہے کہ قلم علم و سچائی کی علامت ہے اور اس کی قسم سے اس بات کا ابطال ہوتا ہے جو مخالفین آپ کے بارے میں کہتے تھے۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی قرآنی قسم بے محل نہیں، ہر قسم اپنے جواب کے ساتھ ایک حسین معنوی ربط رکھتی ہے۔

مناسبت معلوم کرنے کی اہمیت

مقسم بہ اور مقسم علیہ کی مناسبت کو تلاش کرنا تفسیر کا ایک لطیف اصول ہے۔ اس سے سورت کا مرکزی مضمون واضح ہوتا ہے، آیات کے درمیان ربط سمجھ میں آتا ہے اور بعض اوقات قرآن کی بلاغت و اعجاز کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے وہ یا تو اس کی قدرت و وحدانیت کی آیات ہیں، یا اس نعمت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس پر قسم کے بعد گفتگو ہوگی، یا اس دعوے کی دلیل بنتی ہیں جس کی تاکید مقصود ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر مفسر قسموں کو محض افتتاحیہ نہیں سمجھتا بلکہ انہیں مقصد کی طرف لے جانے والی تمہید قرار دیتا ہے۔ طالب علم جب اس نظر سے سورتوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے قرآن کی داخلی تنظیم و ترتیب کا حسن غیر معمولی طور پر محسوس ہوتا ہے۔

نتیجہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآنی قسموں میں مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مابین ہمیشہ ایک گہری اور حکیمانہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ مناسبت کبھی دلیل و برہان کی صورت میں ہوتی ہے، کبھی موضوعی تعلق کی صورت میں، اور کبھی لطیف معنوی اشاروں کی صورت میں۔ اس مناسبت کی تلاش قرآن کے فہم کو گہرا کرتی ہے اور یہ بات ثابت کرتی ہے کہ قرآن کا ہر لفظ اپنے محل پر کمال حکمت کے ساتھ رکھا گیا ہے، اور یہی اس کے اعجاز کی روشن دلیل ہے۔

سوال نمبر :4 قصص کا معنی و مفہوم، قرآن میں اس کے استعمالات اور مترادفات 20)

نمبر(

سوال نمبر4 ۔ قصص کا معنی و مفہوم اور قرآن کریم میں اس کے مختلف استعمال اور اس کے مترادفات واضح کیجئے۔

تعارف

قرآن کریم کا ایک بڑا اور مؤثر حصہ گزشتہ انبیاء و امم کے واقعات و قصص پر مشتمل ہے۔ یہ قصے محض تاریخی معلومات فراہم کرنے کے لیے نہیں بیان ہوئے بلکہ ان کا اصل مقصد عبرت، نصیحت اور ہدایت ہے۔ علوم القرآن میں ان قصوں کے مطالعے کو" قصص القرآن "کہا جاتا ہے اور یہ اس علم کی ایک مستقل و اہم بحث ہے۔ اس بحث کی ابتدا لفظ" قصص "کے لغوی و اصطلاحی مفہوم، قرآن میں اس کے مختلف استعمالات اور اس کے مترادف الفاظ کی وضاحت سے ہوتی ہے، کیونکہ جب تک ان بنیادی امور کی صحیح تفہیم نہ ہو، قرآنی قصص کے مقاصد و اسرار کو ٹھیک طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

قصص کا لغوی مفہوم

"قصص "عربی زبان کے مادہ" ق ص ص "سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا، آثار تلاش کرنا اور پیچھے پیچھے چلنا ہیں۔ عرب کہتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کے قصص کی پیروی کی، یعنی وہ اس کے نشاناتِ قدم دیکھ کر اس کے پیچھے چلا۔ قصہ بیان کرنے والے کو بھی اسی مناسبت سے قاص کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ واقعات کو ترتیب و تسلسل کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے گویا وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہو۔ قرآن کریم میں یہ مادہ اسی لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورۃ الکہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے خادم کے واقعے میں فرمایا گیا کہ وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے واپس پلٹے، اور وہاں لفظ" قصصا "استعمال ہوا۔ اسی طرح سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی بہن سے فرمایا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ، تو وہ دور سے

دیکھتی رہی، وہاں بھی یہی مادہ اسی اصل مفہوم میں آیا ہے۔ اس لغوی پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ محض افسانہ یا من گھڑت داستان کا نام نہیں، بلکہ واقعے کی حقیقت کی تلاش و ترتیب کے ساتھ اس کا بیان ہے۔

قصص کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں قصص سے مراد وہ سچے واقعات و خبریں ہیں جو قرآن کریم نے گزشتہ انبیاء، صالحین، اممِ سابقہ اور عصرِ نبوی کے بعض واقعات کے بارے میں بیان کی ہیں تاکہ ان سے عبرت و نصیحت حاصل کی جائے۔ قرآنی قصص کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی صداقت ہے۔ خود قرآن نے اپنے قصص کو "احسن القصص "یعنی بہترین قصہ اور" القصص الحق " یعنی سچا قصہ قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ بیان کردہ واقعات حقائق پر مبنی ہیں، انسانی تخیل کے بُنّے ہوئے افسانے نہیں۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ قرآنی قصے مقصد کے تابع ہوتے ہیں :واقعے کا صرف وہ حصہ بیان کیا جاتا ہے جو درس و عبرت سے متعلق ہو، غیر ضروری تفصیلات چھوڑ دی جاتی ہیں، اور ایک ہی قصہ مختلف سورتوں میں مختلف پہلوؤں کے ساتھ اس سیاق کے مطابق آتا ہے جہاں وہ نازل ہوا۔ اسی لیے قصص القرآن کو تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ ہدایت کی کتاب کا تربیتی اسلوب سمجھنا چاہیے۔

قرآن کریم میں لفظِ قصص کے مختلف استعمالات

قرآن کریم میں لفظ قصص اور اس کے مشتقات متعدد مقامات پر مختلف مفاہیم میں استعمال ہوئے ہیں۔ سورۃ یوسف میں پورے قصۂ یوسف کو" احسن القصص "کہا گیا اور وہیں یہ بھی فرمایا گیا کہ انبیاء کے قصوں میں اہلِ عقل کے لیے عبرت ہے۔ سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہی سچا قصہ ہے۔ سورۃ الاعراف میں اہلِ مکہ کو حکم دیا گیا کہ قصہ بیان کرو تاکہ وہ غور و فکر کریں، اور وہاں بھی قصص سے مراد گزشتہ امتوں کے واقعات ہیں۔ سورۃ ہود میں فرمایا گیا کہ ہم آپ کو انبیاء کی خبروں میں سے وہ سب بیان کرتے ہیں جس سے آپ کے دل کو مضبوط کریں۔ کہیں یہ لفظ بدلہ و قصاص کے شرعی حکم کے معنی میں آیا ہے، جہاں قصاص کو زندگی کی ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ کہیں" قص "کا لفظ کاٹنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جیسے سورۃ القصص میں پرندے کے بیان میں مختلف صورتیں آتی ہیں۔ اس تنوع سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ لفظ قصص کا مفہوم سیاق و سباق سے متعین ہوتا ہے، تاہم اس کا غالب استعمال سچے واقعات کے بیان ہی میں ہے۔

قصص کے مترادفات :نبأ، خبر، حدیث اور انباء

قرآن کریم نے قصوں کے بیان کے لیے کئی الفاظ استعمال کیے ہیں جو بظاہر مترادف معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں لطیف فرق موجود ہے۔ پہلا لفظ" نبأ "ہے جس کے معنی اہم و عظیم خبر کے ہیں، اسی لیے قرآن نے اہم ترین واقعات کو نبأ کہا، مثلاً دو بیٹیوں کے واقعے کو" نبأ ابنی آدم بالحق "اور قیامت کو" النبأ العظیم "کہا گیا۔ دوسرا لفظ" خبر "ہے جو عام خبر و اطلاع کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہل سے فرمایا کہ میں آگ دیکھ رہا ہوں، شاید وہاں سے کوئی خبر لے آؤں۔ تیسرا لفظ" حدیث "ہے جو بات و واقعہ دونوں معنوں میں آتا ہے، چنانچہ بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس حضرت ابراہیم کے مہمانوں کی حدیث پہنچی ہے، یا حضرت موسیٰ کی حدیث تم تک آئی ہے۔ چوتھا لفظ" انباء "ہے جو نبأ کی جمع ہے اور سابقہ قوموں کی خبروں کے لیے بکثرت استعمال ہوا ہے۔ پانچواں لفظ" اسانید "سے الگ ایک اور اہم لفظ" آثار "اور" مثَل "بھی قصہ کے قریب المعنی ہیں، جب واقعے کو دنیا کے لیے نمونہ قرار دیا جائے۔

ان الفاظ کے درمیان فرق یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ" خبر "عام اطلاع کا نام ہے جس میں سچ جھوٹ دونوں کا احتمال رہتا ہے، جبکہ" نبأ "وہ خبر ہے جو اہم بھی ہو اور یقینی بھی ہو۔" حدیث "میں بات چیت و روایت کا پہلو نمایاں ہے، جبکہ" قصص "میں واقعات کی ترتیب، تسلسل اور پیروی کا مفہوم غالب ہے۔ اسی لیے جب قرآن کسی قوم کے مکمل واقعے کو تسلسل کے ساتھ بیان کرتا ہے تو لفظ قصص آتا ہے، اور جب کسی بڑے غیر معمولی واقعے کی طرف تنبیہ کرنی ہو تو لفظ نبأ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لطیف فرق قرآن کے اسلوبِ بیان کا حسن ہے اور اس سے مترادفات کے مفاہیم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جدول :قصص اور اس کے مترادف الفاظ کا مفہومی فرق

لفظ	بنیادی مفہوم	قرآنی استعمال کی مثال
قصص	واقعات کا ترتیب و تسلسل کے ساتھ بیان، آثار کی پیروی	سورۃ یوسف میں پورے قصے کو احسن القصص کہا گیا
نبأ	اہم اور یقینی خبر	قیامت کو النبأ العظیم اور واقعۂ ابنی

		آدم کو نبأ کہا گیا
خبر	عام اطلاع و آگاہی	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آگ سے خبر لانے کا ذکر
حدیث	بات، واقعہ اور روایت	حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کی حدیث کا ذکر
انباء	سابقہ قوموں کی یقینی خبریں	گزشتہ امتوں کے انجام کی خبریں بیان کی گئیں

قصص القرآن کے مقاصد

ان استعمالات اور مترادفات کی وضاحت کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن نے قصوں کو محض دلچسپی کے لیے نہیں بلکہ بلند مقاصد کے لیے بیان کیا ہے۔ پہلا مقصد عبرت و نصیحت ہے، چنانچہ فرمایا گیا کہ ان کے قصوں میں اہلِ عقل کے لیے بڑی عبرت ہے۔ دوسرا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے دلوں کی تثبیت و تقویت ہے، کیونکہ سابقہ انبیاء کی تکالیف و کامیابیوں کا ذکر داعی کے حوصلے کو بلند کرتا ہے۔ تیسرا مقصد رسالت کی تصدیق ہے، کیونکہ امی نبی کا ان درست واقعات کو بیان کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وحی ہے۔ چوتھا مقصد سابقہ کتب و انبیاء کی تصدیق اور ان کی تعلیمات کی تکمیل ہے۔ پانچواں مقصد یہ ہے کہ قصص انسانی فطرت کے آئینے ہیں، جن میں ہر دور کا انسان اپنی زندگی کی رہنمائی تلاش کر سکتا ہے۔

نتیجہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قصص کا لغوی مفہوم آثارِ واقعہ کی پیروی اور اس کا مرتب بیان ہے، اصطلاحاً یہ قرآن کے بیان کردہ سچے واقعات کا نام ہے جو عبرت و ہدایت کے لیے ذکر کیے گئے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ احسن القصص، القصص الحق اور دیگر صورتوں میں آیا ہے اور اس کے مترادفات نبأ، خبر، حدیث اور انباء میں سے ہر لفظ اپنے خاص مفہومی رنگ کے

ساتھ استعمال ہوا ہے۔ ان فرقوں کو ملحوظ رکھ کر قصص القرآن کا مطالعہ کیا جائے تو ان واقعات کی علمی و تربیتی قدر و قیمت پوری طرح سامنے آتی ہے۔

سوال نمبر :5 تجوید القرآن سے مراد اور تجوید کے احکام 20) نمبر(

سوال نمبر5 ۔ تجوید القرآن سے کیا مراد ہے؟ تجوید کے احکام تفصیل کے ساتھ تحریر کیجئے۔

تعارف

قرآن کریم صرف پڑھنے کی کتاب نہیں بلکہ اس کی تلاوت کا ایک مخصوص اور عظیم الشان نظام بھی ہے جسے" تجوید " کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا کہ قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اور واضح طور پر پڑھو، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اسی انداز میں تلاوت فرمایا جس انداز میں جبریل علیہ السلام نے آپ کو پڑھایا تھا۔ علوم القرآن میں تجوید ایک مستقل فن و علم ہے جس کے اصول و قواعد صحابہ کرام کے دور سے منقول چلے آ رہے ہیں اور جس پر ائمہ قرأت نے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں امام ابن جزری کی منظومہ" المقدمة الجزريه "سب سے مشہور ہے۔ اس سوال میں پہلے تجوید کا مفہوم و اہمیت بیان کی جائے گی، پھر اس کے اہم احکام تفصیل سے تحریر کیے جائیں گے۔

تجوید کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

تجوید عربی زبان کے مادہ" ج و د "سے باب تفعیل کا مصدر ہے جس کے لغوی معنی کسی چیز کو عمدہ، بہتر اور خوب صورت بنانے کے ہیں۔ اصطلاح میں تجوید سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے ہر حرف کو اس کے صحیح مخرج سے، اس کی تمام صفات کے ساتھ، اس طرح ادا کیا جائے کہ تلاوت اس کیفیت کے مطابق ہو جس کیفیت کے ساتھ قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ اس تعریف سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں :پہلی یہ کہ ہر حرف کا اپنا مخصوص مقامِ ادائیگی یعنی مخرج ہے، دوسری یہ کہ ہر حرف کی کچھ ذاتی و عارضی صفات ہیں جن کی رعایت ضروری ہے، اور تیسری یہ کہ اس فن کا معیار تلقی و مشافہہ ہے، یعنی استاد سے سن کر اور اس کے سامنے پڑھ کر سیکھنا، صرف کتاب پڑھ لینا کافی نہیں۔ امام ابن جزری نے فرمایا کہ تجوید پر عمل کرنا لازم ہے، جو شخص قرآن کی تجوید نہیں کرتا وہ گناہ گار ہے، کیونکہ اللہ نے قرآن کو تجوید ہی کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور اسی طرح ہم تک پہنچا ہے۔

تجوید کی اہمیت و حکم

تجوید کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہے کہ لفظی ادائیگی کی معمولی غلطی بھی کبھی معنی بدل دیتی ہے۔ اگر کسی حرف کو اس کے مخرج کے بجائے قریب کے مخرج سے ادا کیا جائے تو لفظ ہی بدل جاتا ہے اور نماز تک کی صحت متاثر ہو سکتی ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک اتنی تجوید سیکھنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے جس سے حروف صحیح ادا ہوں اور نماز و تلاوت درست ہو، اور اس فن کی باریکیوں میں کمال حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے تاکہ ہر دور میں اس فن کے ماہر موجود رہیں۔ تجوید سے تلاوت میں حسن و جمال پیدا ہوتا ہے، قاری و سامع دونوں کے دلوں پر قرآن کا گہرا اثر ہوتا ہے اور آیات کے مفاہیم زیادہ واضح ہو کر ذہن میں اترتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مساجد و مدارس میں قرآن کی تعلیم ہمیشہ تجوید کے ساتھ دی جاتی رہی ہے۔

مخارج الحروف

تجوید کا پہلا بنیادی باب مخارج ہے۔ مخرج اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے حرف کی آواز نکلتی ہے۔ امام خلیل اور امام ابن جزری کے مشہور قول کے مطابق حروف کے مخارج سترہ ہیں جو پانچ بڑے مقامات میں تقسیم ہوتے ہیں :جوف یعنی منہ اور حلق کی خالی جگہ جہاں سے حروفِ مدہ نکلتے ہیں، حلق یعنی گلا جس کے تین مخارج سے چھ حروف نکلتے ہیں، لسان یعنی زبان جس کے دس مخارج سے اٹھارہ حروف ادا ہوتے ہیں، شفتان یعنی دونوں ہونٹ جن سے چار حروف نکلتے ہیں، اور خیشوم یعنی ناک کی جڑ جہاں سے غنہ کی آواز آتی ہے۔ ہر حرف کو اسی کے مخرج سے ادا کرنا لازم ہے، مثلاً ح اور ہ، س اور ص، ت اور ط، ذ اور ز کے درمیان فرق مخارج ہی کی پہچان سے ممکن ہوتا ہے۔ ماہر قاری مشق کے ذریعے ان مخارج کو اس طرح درست کرتا ہے کہ ہر حرف دوسرے سے ممتاز سنائی دے۔

صفات الحروف

تجوید کا دوسرا بڑا باب صفاتِ حروف کا ہے۔ صفت سے مراد وہ کیفیت ہے جو حرف کی ادائیگی کے وقت آواز میں پیدا ہوتی ہے۔ صفات کی دو بڑی قسمیں ہیں :صفاتِ لازمہ جو ہر حال میں حرف کے ساتھ رہتی ہیں، اور صفاتِ عارضہ جو کسی سبب سے پیدا ہوتی ہیں، جیسے ادغام اور تفخیم کی مخصوص صورتیں۔ صفاتِ لازمہ میں نمایاں یہ ہیں :ہمس یعنی

آواز کا خفی ہونا، جہر یعنی آواز کا واضح و ظاہر ہونا، شدت یعنی آواز کا رک جانا، رخوت یعنی آواز کا جاری رہنا، استعلاء یعنی حرف کا موٹا و پر آواز ہونا، استفال یعنی حرف کا باریک ہونا، اطباق، انفتاح، قلقلہ اور صفیر وغیرہ۔ صفات کی اس تفصیل کا فائدہ یہ ہے کہ متقارب الحروف ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، مثلاً ط اور ت میں اصل فرق استعلاء و اطباق کی صفات ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ جو قاری مخارج و صفات دونوں کا اہتمام کرتا ہے اس کی تلاوت کو محققین صحیح و معیاری قرار دیتے ہیں۔

نون ساکنہ و تنوین اور میم ساکنہ کے احکام

احکامِ تجوید میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والے احکام نون ساکنہ و تنوین کے ہیں۔ نون ساکنہ یا تنوین کے بعد آنے والے حرف کے اعتبار سے اس کے چار حکم ہیں۔ پہلا اظہار ہے :اگر نون ساکنہ کے بعد حروف حلقی چھ حروف یعنی ہمزہ، ہا، عین، حا، غین، خا میں سے کوئی آئے تو نون کو ظاہر کر کے بغیر غنہ کے پڑھا جاتا ہے۔ دوسرا ادغام ہے :اگر بعد میں یرملون کے چھ حروف میں سے کوئی آئے تو نون اس میں مدغم ہو جاتا ہے، چار حروف میں غنہ کے ساتھ اور لام و را میں بغیر غنہ کے۔ تیسرا اقلاب ہے :اگر بعد میں با آئے تو نون میم میں بدل کر غنہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ چوتھا اخفاء ہے : باقی پندرہ حروف کے آنے پر نون کو چھپا کر غنہ کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میم ساکنہ کے تین احکام ہیں :با کے ساتھ اخفاء شفوی، میم کے ساتھ ادغام شفوی، اور باقی حروف کے ساتھ اظہار شفوی، جبکہ فا اور واؤ کے موقع پر اظہار کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

جدول :نون ساکنہ و تنوین کے چار احکام

حکم	شرط) بعد والا حرف(	کیفیتِ ادائیگی
اظہار	حروف حلقی :ء، ہ، ع، ح، غ، خ	نون واضح اور بغیر غنہ کے پڑھا جائے
ادغام	یرملون :ی، ر، م، ل، و، ن	نون بعد والے حرف میں ملا دیا جائے؛ لام و را میں غنہ نہیں
اقلاب	با	نون کو میم میں بدل کر غنہ کے

		ساتھ پڑھا جائے
اخفاء	باقی پندرہ حروف	نون کو چھپا کر غنہ کے ساتھ ادا کیا جائے

احکامِ مد

تجوید کا ایک اور اہم باب مد کا ہے۔ مد کے معنی دراز کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں حرفِ مد کو اس کی طبعی مقدار سے زیادہ کھینچ کر پڑھنے کو مد کہتے ہیں۔ حروفِ مد تین ہیں: الف ساکنہ ما قبل مفتوح، واؤ ساکنہ ما قبل مضموم اور یا ساکنہ ما قبل مکسور۔ مد کی بنیادی قسم مدِ طبعی یا اصلی ہے جس میں حرفِ مد کو دو حرکتوں کے برابر کھینچا جاتا ہے۔ اس کے بعد فرعی مدود ہیں جو ہمزہ یا سکون کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔ مدِ متصل جہاں ایک ہی کلمہ میں حرفِ مد کے بعد ہمزہ آ جائے، یہ واجب ہے اور چار پانچ حرکتوں تک کھینچا جاتا ہے؛ مدِ منفصل جہاں ہمزہ اگلے کلمہ میں ہو، اس میں جواز ہے؛ مدِ لازم جس میں حرفِ مد کے بعد ساکن اصلی آئے؛ مدِ عارض للسکون جو وقف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے؛ اور مدِ بدل و مدِ لین وغیرہ۔ مدود کی مقادیر کی رعایت سے تلاوت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی صفت بیان کی گئی ہے کہ آپ مد کو خوب دراز فرماتے تھے۔

قلقلہ، تفخیم و ترقیق اور وقف و ابتدا

دیگر اہم احکام میں قلقلہ نمایاں ہے۔ یہ” قطب جد “کے پانچ حروف میں پائی جانے والی صفت ہے کہ ساکن ہونے کی حالت میں ان کی آواز میں ایک حرکت و لرزش سی پیدا ہوتی ہے تاکہ حرف واضح سنائی دے۔ تفخیم و ترقیق کا تعلق حرف کی موٹی و باریک آواز سے ہے :حروف مستعلیہ ہمیشہ پُر پڑھے جاتے ہیں، راء کی تفخیم و ترقیق اس کے ماقبل کی حرکت کے تابع ہوتی ہے، اور لفظ اللہ کا لام ماقبل فتحہ یا ضمہ پر مفخم اور کسرہ پر مرقق ہوتا ہے۔ وقف و ابتدا کا باب تلاوت کے معنی کی حفاظت کے لیے نہایت اہم ہے :وقف کی چار مشہور قسمیں تام، کافی، حسن اور قبیح ہیں۔ وقفِ قبیح سے بچنا لازم ہے کیونکہ غلط جگہ ٹھہرنے سے معنی بگڑ سکتا ہے، اسی لیے مصاحف میں وقف کی علامات مقرر کی

گئی ہیں جن کی رعایت ہر قاری کے لیے ضروری ہے۔ روم و اشمام اور سکتہ جیسی باریک صنائع بھی اسی فن کا حصہ ہیں جو روایتِ حفص میں بعض مخصوص مقامات پر اختیار کی جاتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تجوید القرآن سے مراد قرآن کے ہر حرف کو اس کے مخرج و صفات کے ساتھ اس صحیح کیفیت میں ادا کرنا ہے جس سے وہ نازل ہوا۔ اس کے احکام میں مخارج و صفات کی پہچان، نون و میم ساکنہ کے قواعد، مدود کی مقادیر، قلقلہ، تفخیم و ترقیق اور وقف و ابتدا کے اصول شامل ہیں۔ ان احکام کی رعایت سے تلاوت صحیح بھی ہوتی ہے اور پراثر بھی، اور یہی اس فن کا اصل مقصد ہے۔ ہر طالبِ قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ماہر استاد کے سامنے بیٹھ کر ان احکام کو عملی مشق کے ساتھ سیکھے، کیونکہ تجوید کتاب سے نہیں، تلقی و سماع سے حاصل ہوتا ہے۔